توکّل صبر شکر

نعمان نیئر کلاچوی

توکّل صبر شکر

نعمان نیئر کلاچوی

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام مقالہ	توکّل صبر شکر
مصنف	نعمان نیئرؔ کلاچوی
ناشر	مرشد پبلی کیشنز، کلاچی،ڈیرہ اسماعیل خان
پی ڈی ایف ایڈیشن	اپریل،2026

فہرست

نمبر	عنوانات	صفحہ
1	تمہید	5
2	توکّل	11
3	صبر	18
4	شکر	25

تمہید

بات یہ ہے کہ زندگی آخر کس کی مشکل اور المناک نہیں۔ ہر انسان زندگی میں مختلف دُکھوں اور پریشانیوں سے دوچار ہوتا ہے اور یہ ممکن ہی نہیں کہ کوئی انسان تمام آسائشیں اور سہولیات حاصل کر کے بھی دُکھ اور پریشانی سے جان چھڑا لے۔ فلہٰذا یہاں ایک کمزور اور مفلس دُکھی نہیں ہے بلکہ طاقتور اور صاحبِ ثروت بھی پوری طرح خوار ہے۔

یعنی دُکھ ناگزیر ہے اور اِس سے جیتے جی تو چھٹکارا ممکن نہیں البتہ دُکھ کے ساتھ جی کر ہم اِس کی شدّت کو کم کر سکتے ہیں بلکہ چاہیں تو اپنے دُکھ کو وہ اعلیٰ ترین معنیٰ دے سکتے ہیں کہ جس کے بعد دُکھ تحلیل تو نہیں ہو گا لیکن دُکھ کے اندر موجود زہر غیر مؤثر ہو جائے گا۔

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو یہ سمجھتے ہیں کہ وہ ایک قادر مطلق خدا کی مخلوق ہیں اور یہاں یعنی اِس دنیا میں اِس لئے جی رہے ہیں تا کہ موت کے بعد خدا اُنہیں اُن کے ایمان اور نیک اعمال کے بدلے اَبدی سکون عطاء فرما دے۔ یہ لوگ مؤمن کہلاتے ہیں جبکہ اِس کے برعکس کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات خاموش اور اندھی ہے اور ہم اِس میں ایک بھیانک حادثہ

(Tragic Incident) ہیں اور ہمیں نہیں پتہ کہ ہم کیوں ہیں اور کہاں چلے جاتے ہیں۔ زندگی کے ایسے بھیانک تصور کے ساتھ جینے والے لوگ بس ایک نکتہ ذہن میں بٹھا لیتے ہیں کہ اِس دنیا میں چند روزہ زندگی کو جیسے بھی ہو گا ہم پُر سکون اور پُر آسائش بناتے چلے جائیں گے۔ اب اِس کے علاوہ جو لوگ ہوتے ہیں وہ دراصل اِنہی دونوں راستوں میں سے کسی ایک راستے کے ضمیمے (Extension) پر جی رہے ہوتے ہیں۔

اصل میں بات یہ ہے ہی نہیں کہ انسان کسی قادر مطلق خدا کو مانتا ہے یا نہیں، اصلی بات یہ ہے کہ انسان مستقل طور پر دُکھ سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے یا نہیں؟، تو اِس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ نہیں بھئی نہیں۔

دکھ کیا ہے؟، دکھ حالات کا جبر (Coercion of Circumstances) ہے یعنی جو کچھ انسان کو درپیش (Problem) ہے انسان اُسے اپنے اختیار سے تحلیل (Resolve) نہ کر سکے۔

یہ جبر دراصل دو طرح سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک قدرتی قوانین کے تعامل (Process) سے دوسرا انسان کے اپنے اختیار سے، چنانچہ یہی دو صورتیں ہیں جو ایک انسان کی زندگی اور اِس کائنات میں دکھ پیدا کر رہی ہیں۔

یاد رکھنے کا نکتہ یہ ہے کہ انسان مطلق حیوان (Animal) نہیں ہے جیسے بھیڑ بکری گائے بیل بلکہ انسان عقل، اخلاق و جمالیاتی احساس اور اِرادہ و اختیار رکھنے والا حیوان ہے۔ اب یہ بات تو ہم بغیر کسی دلیل کے بھی مان لیتے ہیں کہ انسان ایک باشعور حیوان ہے، اگر ایسا ہی ہے جیسا کہ ہے تو پھر انسان کی سب سے بنیادی ضرورت روٹی کپڑا مکان نہیں بلکہ تعلیم و تربیت ہے۔ غور کریں میرے اِس جملے پر جو ایک بار پھر مَیں دُہرا رہا ہوں کہ ایک انسان کی نہ کہ حیوان کی سب سے بنیادی ضرورت تعلیم و تربیت ہے نہ کہ روٹی، کیوں؟، کیونکہ انسان کا مسئلہ روٹی کپڑا اور مکان کے بعد بھی حل نہیں ہوا، اِس لئے ہم یہ بات کہنے پر مجبور ہو گئے کہ سب سے پہلے انسان کی ضرورت کچھ اور ہے۔

ایک بیل کی بنیادی اور اعلیٰ ترین ضرورت تازہ گھاس ہے اور بس، لیکن ایک انسان کی بنیادی اور اعلیٰ ترین ضرورت صرف اچھا کھانا نہیں بلکہ کچھ اور بھی ہے۔ غور کریں اگر انسان کی بنیادی اور اعلیٰ ترین ضرورت صرف اچھا کھانا قرار دے دی جائے تو بتائیے ایک بیل اور ایک انسان میں بنیادی فرق کیا رہا؟، کچھ بھی نہیں، تو کیا انسان واقعتاً بیل ہے؟، نہیں تو، تو پھر غور کیجئے کہ انسان کیا ہے۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ انسان کو روٹی بھی چاہئے لیکن ایک انسان کو سب سے پہلے اِس سوال کا جواب چاہئے کہ وہ کیوں ہے؟، چنانچہ جب تک ایک انسان اِس انتہائی بنیادی سوال

کا جواب نہیں ڈھونڈ لیتا تب تک انسان کے کسی بھی مسئلے کا حل اُسے پُر سکون نہیں کر سکتا، چاہے وہ مسئلہ آخری درجے میں ناگزیر کیوں نہ ہو۔

یہی وجہ ہے کہ گوتم بدھ نے جب اپنے شعور کی بنیاد پر انسانی دکھوں کا یہ حل نکالا کہ انسان کے ہونے کے سوال کو ہی ترک دیا جائے تو ہوتا ہوں کہ مسئلہ ترک کر دینے سے مسئلہ غائب ہو جاتا، اُلٹا مسئلہ مزید اُبھر کر سامنے آ گیا کہ بدھ جو ہمیں نیک سیرت بنا رہے ہیں آخر کیوں بنا رہے ہیں؟، پہلے یہ تو بتائیں کہ ہم کون ہیں اور کیوں ہیں؟۔ یہ بات بڑی دلچسپ ہے کہ گوتم بدھ سے اُن کے مخاطب بیس سوال کبھی نہ پوچھ سکتے تھے، ہاں اِن سوالات کے علاوہ جو کچھ پوچھنا چاہتے، پوچھ لیتے۔ چنانچہ اِنھی بیس سوالوں میں سے ایک سوال یہ بھی تھا کہ انسان کیوں ہے۔ انسان کیوں ہے کو فلسفے میں "معنیٰ کا سوال" کہتے ہیں اور اب تک انسانی عقل اِس کا کوئی جواب نہ دے سکی۔ پس اگر خدا کے برگزیدہ بندے یعنی انبیاء کرام نہ ہوتے تو انسان کبھی سُکھ کا سانس نہ لے پاتا۔

نبی اور رسول اِس لئے بھیجے جاتے ہیں تاکہ وہ انسان کو بتا سکیں کہ وہ کون ہے اور اُسے اپنی زندگی میں کیا کچھ کرنا ہے۔ یہ ایک طرح سے خدائی تعلیم ہے جو سب سے پہلے انبیاء کو ملتی ہے بعد میں وہ یہ تعلیم اپنے مخاطبین تک پہنچاتے ہیں۔ پس یہ تعلیم

ہر زمانے میں انسانوں کو ملتی رہی اور آخری بار یہ تعلیم خطّہِ حجاز کے صحرا نشین حضرت محمد ابن عبداللہ ﷺ کی وساطت سے انسانیت کو نصیب ہوئی۔

ذہن نشین رہے کہ اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ خداتعالیٰ اپنی تعلیم کس خطّے یا کس دَور میں کس انسان کے سپرد کرتا ہے لیکن اصل مسئلہ حل ہوجاتا ہے جب یہ تعلیم بہرحال انسانوں تک پہنچ جاتی ہے۔ مثلاً جس دَور میں گوتم بدھ اپنے وجود کا معنٰی ڈھونڈ رہے تھے ٹھیک اُسی دَور میں مشرقِ وسطیٰ میں زکریا نبی اور فارس کے درباروں میں دانیال نبی کی تعلیمات پہنچ چکی تھیں۔

ایسا بھی ہوتا تھا کہ جس خطّے میں نبی مبعوث ہوتا اُسی خطّے کا ایک مؤمن نبی کی تعلیمات لیکر کسی دوسرے مقام پر پہنچ جاتا۔ یوں کہیں تو براہِ راست نبی کی وساطت سے اور کہیں نبی کے شاگردوں کی وساطت سے خدا کی تعلیم بہرحال پہنچ جاتی اور اِس تعلیم سے کوئی دَور مکمل طور پر خالی نہیں رہا۔

پس ثابت ہوا کہ خدا کی نازل کردہ تعلیم بہرحال دنیا کے ہر انسان تک کسی نہ کسی صورت میں پہنچتی رہی۔ بالفرض کسی انسان تک خدا کی تعلیم نبی یا نبی کے شاگردوں کی وساطت سے نہیں بھی پہنچی تو بھی خدا نے انسان کے اندر اخلاقی شعور رکھ دیا ہے اور اِس اخلاقی شعور کی موجودگی میں انسان کسی بھی دَور میں مطلق حیوان نہیں بن

پایا۔اِس لئے دیکھا جائے تو گوتم بدھ نبی نہ ہونے کے باوجود بھی اخلاقی تعلیم ایسے دیتے ہیں جیسے کہ کوئی نبی ہوں یا کسی نبی کے شاگرد۔اِس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ ایک باشعور انسان کبھی بھی اور کسی بھی موقع پر اخلاقیات سے عاری نہ رہا۔

بات بہت دُور نکل گئی جبکہ کہنے کا مقصد یہ تھا کہ انسان کی بنیادی ضرورت تعلیم ہے اور یہ تعلیم افلاطون یا ارسطو کی تعلیم نہیں بلکہ خدا کے برگزیدہ بندوں یعنی انبیاء کرام کی تعلیم ہے جسے حاصل کرکے ایک انسان حالات کے جبر کی مکمل وضاحت پا لیتاہے بلکہ مشکل سے مشکل ترین حالتِ جبر میں بھی ایک لمحے کیلئے بھی نہ گھبراتا ہے اور نہ ہی خوفزدہ ہوکر زندگی سے فرار حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

پس اِسی تعلیم میں سے آج مَیں تین بنیادی نفسیاتی ردِّ عمل (Psychological Reaction)یعنی توکّل، صبر اور شکر پر تفصیلی بات کرنا چاہتاہوں۔

توکّل

ہماری سرائیکی زبان میں ایک محاورہ ہے کہ "توکّل دے بیڑے پار" یعنی جس انسان نے توکّل کا دامن تھام لیا وہ بہر حال مصائب سے نکل آئے گا۔ توکّل ہے کیا۔ توکّل عربی لفظ وکیل کا اسمِ فعل (Verb) ہے یعنی کسی پر بھروسہ کر لینا۔ جیسے ایک مظلوم کسی قانون کے ماہر یعنی وکیل پر بھروسہ کر کے اُسے اپنی طرف سے عدالت میں پیش کر دیتا ہے تاکہ اُسے انصاف مل سکے بالکل ایسے ہی جب ایک مؤمن خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ کر کے انصاف کی اُمید رکھ لیتا ہے تو اِسے قرآن کی اصطلاح میں توکّل کہا جاتا ہے۔ توکّل کو انگریزی میں Trust in God کہتے ہیں۔

توکل کو سمجھنے سے قبل یہ دیکھ لیں کہ انسان کے پاس ہے کیا۔ انسان کے پاس ایک عدد وجود ہے، ایک عدد عقل ہے، ایک عدد اِرادہ و اختیار ہے جسے آجکل Free Will بھی کہا جاتا ہے۔ اب جب انسان اپنی زندگی میں کسی کام کے کرنے کا اِرادہ کر لیتا ہے تو اُس کام کو کرنے کیلئے انسان پہلے اپنی عقل اور بعد میں اختیار کو استعمال کرتا ہے۔ عقل سے انسان اپنے کام کی پلاننگ کرتا ہے اور اختیار سے اُسے انجام دیتا ہے لیکن معاملہ یہاں ختم تو نہیں ہوتا کیونکہ آگے کام کا کوئی نتیجہ (Outcome) بھی آنا باقی ہوتا ہے چنانچہ اِسی وقفے میں یعنی کام کے انجام دینے

کے بعد سے نتیجے تک کے دورانیے (Period) میں انسان آخر کیا کرے، یا کچھ بھی نہ کرے؟۔ چنانچہ اگر انسان مؤمن نہیں ہے تو اِس دوران وہ سخت ذہنی انتشار (Confusion) سے جان نہیں چھڑا سکتا جبکہ اِس کے بر عکس اگر انسان مؤمن ہے تو پھر وہ اپنے وکیل یعنی خدا تعالیٰ پر بھروسہ کر سکتا ہے کہ وہ اِس کے ساتھ جو بھی کرے گا بہر حال اِس کے حق میں بہتر ہو گا۔

آپ نے انگریزی کی یہ اصطلاح یعنی Confusion بہت بار سنی ہو گی لیکن کبھی اِس کے حقیقی معنیٰ پر غور نہیں کیا ہو گا کہ آخر اِس کا کیا مطلب ہے لیکن ابھی آپ پلّے باندھ لیں کہ کنفیوژن دراصل عدم توکّل کا دوسرا نام ہے۔

اصل میں مسئلہ یہ ہے کہ نتیجہ تک کے دورانیے میں ایک غیر مؤمن کر بھی کیا سکتا ہے یعنی اُس کے پاس کچھ کرنے کا آپشن ہی نہیں ہوتا کیونکہ جو کچھ وہ کر سکتا تھا، کر چکا۔ لیکن اِس کے بر عکس ایک مؤمن تو پہلے ہی یہ یقین پیدا کر چکا کہ میری عقل ناقص اور عمل ادھورا ہے جب تک خدا تعالیٰ میری عقل اور عمل میں وہ قوّت ہی نہ پیدا کر دے جو میرے سامنے مثبت نتائج لے آئے، مَیں خدا پر بھروسہ رکھوں گا اِس لئے ایک مؤمن کی عقل اور اُس کا اختیارِ عمل سے پہلے بھی ایک ٹھوس بنیاد پر کھڑا ہوتا ہے اور نتیجہ نکلنے کے دورانیے میں بھی وہ ایک مضبوط نفسیاتی مقام پر پہنچ

جاتا ہے یعنی کہ اب نتیجہ جو بھی ہو بہر حال اِس میں خدا تعالیٰ کی عنایت یا کوئی مصلحت شامل ہو گی۔ پس نتیجہ مثبت ہے تو یہ خدا تعالیٰ کی عنایت ہو گئی، منفی ہے تو اِس میں میری ذات کیلئے کوئی مصلحت چھپی ہو گی۔ عنایت یعنی کرم نوازی اور مصلحت یعنی منفی نتیجے میں ایک مؤمن کی اصلاح کا چھپا ہونا جو بہر حال کسی وقت میں ظاہر ہو جائے گی، چنانچہ اِس دنیا میں نہ سہی تو آخرت میں اِس منفیت کا معنیٰ نکل آئے گا۔ یہ ہے توکّل جو ایک مؤمن کا مضبوط نفسیاتی ہتھیار (Psychological Weapon) ہے۔

بتایئے اب! زندگی گزارنے کیلئے خدا کی تعلیم زیادہ معقول اور زیادہ تسلی بخش ہے یا انسان کی اپنی عقل سے ترتیب دی گئی تعلیم؟، جس کی ہر بنیاد اِس قدر کمزور ہے کہ یا تو انسان نفسیاتی طور پر ٹوٹ کر بکھر جاتا ہے یا پھر انسان پاگل ہو کر وحشی درندہ بن جاتا ہے۔

قرآن میں اصطلاح توکّل کُل 44 بار آئی ہے اور ہر بار ایک مؤمن کیلئے ایک زبردست نفسیاتی تسلی لیکر آئی ہے۔ یہاں پر مَیں تمام مقامات تو درج نہیں کر سکتا لیکن چند چیدہ چیدہ آیات ضرور عرض کرتا ہوں تاکہ توکّل کی سمجھ اور اہمیت اچھی طرح واضح ہو جائے۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ لِنتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ۔

پھر اللہ کی رحمت کے سبب سے اے نبی تُو اِن کیلئے نرم ہو گیا اور اگر تُو تُند خو اور سخت دل ہوتا تو لوگ تیرے گرد سے بھاگ جاتے پس اِنہیں معاف کر دے اور اِن کے واسطے بخشش مانگ اور کام دھندوں میں اِن سے مشاورت لیا کر، پھر جب تُو اِس کام کا ارادہ کر چکا تو اللہ پر بھروسہ کر، بے شک اللہ توکّل کرنے والے لوگوں کو پسند کرتا ہے۔(سورہ آلِ عمران۔ آیت 159)

یہاں پر خدا تعالیٰ نبی ﷺ کو یہ تلقین کر رہا ہے کہ اگر تُو کسی کام کا ارادہ کر چکا ہے یعنی اُس کام کی پلاننگ اور اُسے عملی جامہ پہنا چکا ہے تو اب نتیجہ کو خدا کی منشاء پر چھوڑ دے، پس جو لوگ اپنے اعمال کے نتائج کو خدا کے بھروسے چھوڑ دیتے ہیں تو ایسے لوگوں کے اِس رویّے کو خدا تعالیٰ بہت پسند کرتا ہے۔ اِس سے اگلی آیت ملاحظہ فرمائیں۔

إِن يَنصُرْكُمُ اللَّهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِن يَخْذُلْكُمْ فَمَن ذَا الَّذِي يَنصُرُكُم مِّن بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ۔

اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر کوئی غالب نہ آ سکے گا اور اگر اُس نے مدد چھوڑ دی تو پھر کون ہے ایسا جو اُس کے علاوہ تمہاری مدد کر سکے اور مؤمنین کو اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیئے۔(سورہ آلِ عمران۔ آیت160)

یعنی توکّل ہی ایک مؤمن کا اصل ہتھیار ہے۔ آیت ایک بالکل دوٹوک پیغام دے رہی ہے کہ اِس کائنات کا واحد کارساز خدا تعالیٰ ہے پس خدا اگر کسی کی مدد ترک کر دے تو پھر اُس کی کائنات میں آخر کون اتنا طاقتور ہے کہ خدا کی جگہ اُس محتاج کی مدد کر سکے۔ یہ آیت انسان کو اُس کا اصلی مقام یاد دِلا رہی ہے کہ انسان جس قدر بھی عقل و شعور کا حامل کیوں نہ ہو جائے اور اپنے تئیں جس قدر بھی مضبوط پلاننگ اور ہر لحاظ سے نپا تُلا عمل کیوں نہ سر انجام دیدے، بہر حال اُس عمل کے نتیجے پر انسان کا کوئی اختیار نہیں ہے۔یعنی مذکورہ آیت میں انسانی اختیار کا دائرہ کار بھی واضح کر دیا گیا کہ انسان مختارِ کُل نہیں بلکہ عبدِ مُختار ہے اور چاہ کر بھی اور ہر لحاظ سے عمدہ ترین عمل کر کے بھی اپنی مرضی کا نتیجہ بر آمد نہیں کر سکتا۔

یوں غور کریں تو توکّل ایک انسان کو خدا کے ساتھ جوڑ کر اُسے ایک سچا مؤمن بنا دیتا ہے۔اِس کے برعکس ایمان نہ ہو تو انسان محض اپنی عقل اور عمل پر بھروسہ کر کے آخرکار تھک ہار جاتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کا انسان جس قدر بھی مادی

آسائشیں کیوں نہ حاصل کرلے اپنے اِرادے اور اختیار کی نارسائی پر ہمیشہ کُڑھتا رہتاہے اور پھر اِسی اذیت ناک صورتحال میں مبتلارہ کر مر کھپ جاتا ہے۔

بتایئے اب! زندگی گزارنے کاسب سے عمدہ اور صحت مند اسلوب خدا سے بے نیاز ہو کر جینے میں ہے یا خدا تعالیٰ کا سچا بندہ بن کر جینے میں ہے؟، پس زور زبردستی والا کوئی معاملہ ہے ہی نہیں، دیکھ لیجئے کہ کس طرف جاناہے۔

یہاں پر اگر مَیں خدا پر ایمان کو صرف ایک لفظ سے تعبیر کروں تو وہ لفظ ہے دراصل "توکّل" چنانچہ توکّل کے بغیر کوئی ایمان نہیں۔

وَقَالَ مُوسَىٰ يَا قَوْمِ إِن كُنتُمْ آمَنتُم بِاللَّهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّسْلِمِينَ۔

اور موسیٰ نے کہا اے میری قوم! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو تو اب اُسی پر بھروسہ بھی رکھو اگر تم مسلم ہو۔ (سورہ یونس۔ آیت84)

یعنی اگر تم خود کو مؤمن کہتے ہو تو پھر خدا پر توکّل رکھو ورنہ ایمان کا کوئی مطلب ہی نہیں بنتا۔ معلوم ہوا کہ ایمان کی سیڑھی کا پہلا قدم ہی خدا پر بھروسے یعنی توکّل سے شروع ہوتا ہے۔ پس توکّل نہیں تو ایمان بھی نہیں اور اگر ایمان نہیں تو پھر کچھ بھی نہیں کیونکہ ایسی صورت میں انسان خود اپنی ذات سے بے بہرہ ہو جاتا ہے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ نَسُوا اللَّهَ فَأَنسَاهُمْ أَنفُسَهُمْ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُونَ۔

اور نہ ہو جانا اُن لوگوں کی طرح جنہوں نے اللہ کو بھُلا دیا، پس ایسے لوگ تو اپنا آپ ہی بھول بیٹھے، یہی لوگ نافرمان ہیں۔ (سورہ الحشر۔ آیت 19)

اپنا آپ بھول بیٹھے یعنی پھر کچھ نہ سمجھ سکے کہ آخر انسان ہے کیا، مطلق حیوان ہے یا کوئی اور بلا۔ پس آج ہر انسان ذہنی انتشار اور مستقل پریشانی جسے آجکل کی اصطلاح میں ٹینشن کہا جاتا ہے کا شکار ہو چکا کیونکہ آج کے انسان کے پاس نہ ایمان ہے اور نہ ہی توکّل۔ آج کا انسان صرف اپنی عقل اور اِرادے کو ہی کافی سمجھتا ہے اور اِسی لئے مرتے دم تک سُکھ کا سانس نہیں لے پاتا۔

☆☆☆☆☆

صبر

صبر یعنی حالتِ جبر میں منفی رویے سے بچ کر مثبت رویہ اختیار کرنا۔ حالتِ جبر یعنی Determined Situation جو یا تو کسی قدرتی آفت کے سبب درپیش ہو گئی یا پھر کسی انسان کے اختیاری عمل کے نتیجے کی صورت میں سامنے آ گئی۔ صبر کو انگریزی میں Fortitude کہا جاتا ہے۔ صبر ایک خالص قرآنی اصطلاح ہے اور قرآن میں یہ اصطلاح کُل 73 بار آئی ہے۔

دیکھیں بات یہ ہے کہ انسان کے پاس عقل اور اختیار ہے۔ اِنہی دونوں کی بنیاد پر انسان کوئی عمل سرانجام دیتا ہے لیکن اُس عمل کے نتیجے (Outcome) پر کوئی قدرت نہیں رکھتا۔ چنانچہ جب نتیجہ منفی آ جائے تو انسان کے پاس دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ نتیجہ قبول نہ کرنا اور اِس کے خلاف مزاحمت کرکے پھر سے ایک نیا عمل سرانجام دینا یا پھر نتیجہ کو شعوری طور پر قبول کرکے آرام سے بیٹھ جانا۔

یہاں پر یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ ظلم و زیادتی پر آرام سے بیٹھ جانا صبر نہیں بلکہ صبر کا درست مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی قدرتی آفت آن پہنچے جسے دفع کرنے کی انسان میں طاقت نہ ہو یا اُسے دفع کرنے کی پوری کوشش کے باوجود انسان ناکام ہو چکا ہو تو تب سکون سے بیٹھنے کا نام صبر ہے۔ دوسری صورت میں اپنے کئے گئے کسی عمل کا

نتیجہ منفی آ جائے تو اُس منفی نتیجہ کو خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی مصلحت سمجھ کر آرام سے بیٹھ جانے کو بھی قرآنی اصطلاح میں صبر کہا جاتا ہے۔

صبر ایک ایسی نفسیاتی تکنیک(Psychological Technique)ہے کہ چاہے کوئی انسان خدا پر ایمان رکھتا ہو یا نہ بھی رکھتا ہو اِس سے فرار حاصل نہیں کر سکتا کیونکہ انسانی زندگی میں حالات کا جبر ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ چنانچہ ایک پیدائشی گونگا(Nonverbal Person)آخر کیا کر سکتا ہے سوائے اِس کے کہ وہ اپنی اِس قدرتی مصیبت پر اپنا ذہنی توازن کھو بیٹھے یا پھر اپنے ردِّ عمل کو مثبت رکھ کر اِس مصیبت پر صبر کا دامن تھام لے۔

صبر ایک ایمانی عمل تو خیر ہے ہی، اِس کے برعکس یہ ایک اعلیٰ ترین نفسیاتی تکنیک بھی ہے۔ انسان اپنی عقل اور اختیار کو بھی ایک خاص حد تک استعمال کر سکتا ہے چنانچہ ایک وقت ایسا بھی آ جاتا ہے کہ انسان اپنی تمام تر ذہانت اور زبردست قوّتِ عمل کو استعمال کرنے کے بعد بھی خالی ہاتھ رہ جاتا ہے، تو بتایئے ایسے میں اگر انسان مؤمن ہو تو اُس کیلئے صبر کتنی بڑی نفسیاتی طاقت بن جاتا ہے جبکہ انسان غیر مؤمن ہو تو غالب اِمکان یہی ہے کہ وہ ایسی بدترین صورتحال میں شدید نفسیاتی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے گا۔

قصّہ مختصر کہ انسان کو زندگی کے ناگزیر مصائب پر بالآخر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔ ع

ضد ہی کام آئی نہ اصرار بہت کام آیا

صبر تھا ایک جو ہر بار بہت کام آیا

سوال یہ ہے کہ آخر قرآن ایک مؤمن کو بار بار اور ہر کٹھن موقع پر صبر کی تلقین کیوں کرتا ہے؟، دراصل اِس لئے تاکہ ایک مؤمن حالات کے جبر میں اپنا ذہنی توازن نہ کھو بیٹھے بلکہ اِس مصیبت کو ایک نادر موقع جان کر خدا تعالیٰ سے اپنا ربط مضبوط کر لے اور جو بھی فریاد کرنی ہو اپنے ربّ کے حضور کرے۔ بالکل اِسی کیفیت کو قرآن ایک مقام پر خدا کے برگزیدہ نبی حضرت یعقوب علیہ السلام کی فریاد کی صورت میں پیش کرتا ہے۔

قَالَ إِنَّمَا أَشْكُو بَثِّي وَحُزْنِي إِلَى اللَّهِ وَأَعْلَمُ مِنَ اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ۔

کہا مَیں تو اپنی پریشانی اور غم کا شکوہ اللہ کے سامنے ہی رکھتا ہوں اور اللہ سے مَیں جیسے واقف ہوں ویسے تم نہیں ہو۔ (سورہ یوسف۔ آیت 86)

یعنی بندے کا خدا کے سامنے فریاد کرنا جرم نہیں بلکہ مصیبت کے وقت بندے کا اپنے ربّ سے برگشتہ ہو جانا جرم ہے کہ کدھر ہے خدا اور کیوں میرا مسئلہ حل نہیں

کرتا اگر تو موجود ہے۔ چلیں انسان برگشتگی (Deviation) بھی اختیار کر لے اور منکر بھی ہو جائے تو انسان کے اِس منفی رویے سے کیا اُس کی تکلیف دُور ہو جائے گی؟، قطعاً نہیں، تو پھر اب کیا صورت باقی بچتی ہے سوائے صبر کرنے کے؟، دراصل کوئی بھی نہیں۔

پس ثابت ہوا کہ قرآن انسان کو ایسا مضبوط نفسیاتی سہارا دیتا ہے جو خدا کے منکر کو بھی مصیبت کے وقت ٹوٹنے نہیں دیتا۔ بتایئے کیا اب بھی خدا پر ایمان ایک غیر معقول انتخاب ہو سکتا ہے؟، جبکہ ایسی عالمگیر ہدایت دراصل انسانی شعور سے پیدا ہی نہیں کی جا سکتی۔

دیکھیں بات یہ ہے کہ قرآن ایک مؤمن کو مہد سے لحد تک یعنی پنگھوڑے سے قبر تک کسی موقع پر بھی تنہاء و بے آسرا اور کمزور و لاچار نہیں چھوڑتا بلکہ ہر ہر موقع پر نفسیاتی لحاظ سے ایسا مضبوط اور متحرک رکھتا ہے کہ ایسی قوّتِ عمل اور نفسیاتی استحکام تو دنیا کے کسی فلسفے یا قانون میں موجود نہیں، پس تجربہ شرط ہے۔

قرآن کے نزدیک انسانی زندگی دراصل حُسنِ عمل کا ایک کٹھن میدانِ کارزار (Battlefield) ہے اور یہاں ہر آنے والا لمحہ گزرے ہوئے لمحے سے زیادہ تکلیف دہ ہے اِس لئے زندگی میں ایک بہادر سپاہی کو ہر طرح کے اسلحے سے لیس

ہونا چاہئے اور یہ اسلحہ ایک انسان کو صرف قرآن ہی فراہم کرتا ہے۔ قرآن کے نزدیک انسان کے پاس محض اُس عقل اور اختیار ہی حتمی ہتھیار نہیں ہیں اور اِن پر کُلّی بھروسہ کافی نہیں بلکہ ایمان، توکّل، صبر اور شکر جیسے نفسیاتی ہتھیار بھی ساتھ رکھنا ضروری ہیں تاکہ ایک مؤمن زندگی کی اِس مسلسل جنگ میں کہیں نفسیاتی شکست کا سامنا نہ کر بیٹھے۔ چنانچہ اِس لحاظ سے خدا پر ایمان اور توکّل، صبر اور شکر ایک انسان کیلئے جہد للبقاء (Survival) کا درجہ رکھتے ہیں نہ کہ محض کوئی اخلاقی انتخاب کہ طبیعت چاہی تو ایمان لے آئے، مزاج بدلا تو منکر ہوگئے۔

اِس لئے کہا جاتا ہے کہ ایمان ایک انسان کا اصلی سرمایہ حیات ہے اور اِس کے بغیر انسان ایک حیوان کی طرح صرف زندہ تو رہ سکتا ہے لیکن ایک صحت مند نفسیاتی و اخلاقی زندگی نہیں گزار سکتا۔ چنانچہ قرآن کا ایک ایک حرف اِس بنیادی حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

وَاسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ ۚ وَإِنَّهَا لَكَبِيرَةٌ إِلَّا عَلَى الْخَاشِعِينَ-

اور حوصلہ پکڑو صلوٰۃ اور صبر کے ذریعے سے، اور یہ واقعتاً مشکل کام ہے مگر اُن کیلئے نہیں جو خدا کے آگے جھک گئے ہیں۔ (سورہ البقرہ۔ آیت 45)

پس زندگی میں مصائب تکلیف اور اُلجھنوں کا در آنا یقینی ہے اور اِن سے کسی صورت فرار ممکن نہیں تو ایسی صورت میں قرآن ایک مؤمن کو تلقین کرتا ہے کہ اپنے ردِّ عمل کو مثبت رکھو اور اِس کی واحد صورت صبر ہے۔

بات یہ ہے کہ اگر ایک انسان کو خدا تعالیٰ کی ذات پر بھروسہ نہ ہو تو وہ جلد یا بدیر اپنی ہی عقل اور اِرادے کے ہاتھوں ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے اور یہ ٹوٹ پھوٹ اِس قدر تباہ کن ہوتی ہے کہ اِس صورت میں یا تو انسان ذہنی توازن کھو بیٹھتا ہے یا پھر زندگی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی غرض سے اپنی ہی زندگی کا خاتمہ کر بیٹھتا ہے یا پھر ظلم و عدوان کا راستہ اختیار کر کے اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کیلئے وحشی درندہ بن جاتا ہے، چوتھی صورت وہی ہے جو ایک مؤمن کی ہوتی ہے کہ صبر کا دامن مضبوطی سے تھام کر راضی برضائے خداوندی ہو جانا۔ اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ صبر کرنا بڑا ہمت کا کام ہے لیکن پھر اِس کے علاوہ آپشن ہی کیا ہے؟، دراصل ایک انسان یہاں لمحہ لمحہ حُسنِ عمل کے امتحان سے دوچار ہے، بھلے وہ مؤمن ہے یا نہیں لیکن لمحِہ موجود (Present Moment) میں وہ کوئی ایک ردِّ عمل یعنی مثبت یا منفی دینے کیلئے مجبور ہے۔ اُوپر ہم چاروں ردِّ عمل بیان کر چکے۔ ایک بار پھر دیکھ لیجئے کہ آپ کو کس طرف جانا ہے، بہر حال قرآن ایک مؤمن کو صبر کی طرف لے جاتا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ۔

اے مؤمنو! صبر کا دامن تھام کے رکھو اور صبر کے پیکر بن جاؤ اور خدا سے جُڑے رہو اور حُسنِ عمل پر کاربند رہو تاکہ تم حقیقی کامیابی تک پہنچ جاؤ۔

(سورہ آلِ عمران۔200)

درج بالا آیت میں ایمان والوں کو دوبار مسلسل صبر کی تلقین کی گئی ہے کہ نہ صرف صبر کرو بلکہ صبر کا چلتا پھرتا مجسمہ بن جاؤ۔یعنی قرآن ایک مؤمن کے ہاتھ میں ظلم کے خلاف صرف تلوار ہی نہیں تھماتا بلکہ اِس جنگ میں جہاں کہیں نفسیاتی ہتھیار کی ضرورت پڑتی ہے تو وہ بھی تھما دیتا ہے کہ یہ نہ ہو کہ مصیبت و تکلیف کے وقت تلوار پھینک کر میدانِ جنگ سے بھاگ کھڑے ہو۔

بتایئے ذرا! آخر دنیا کی کونسی مذہبی کتاب یا قانون انسان کو اِس اعلیٰ ترین نفسیاتی اور اخلاقی سطح پر لے جانے کا انتظام کرتی ہے؟،شاید کوئی بھی نہیں۔

☆☆☆☆☆

شکر

شکر ایک مثبت نفسیاتی تکنیک ہے جسے انگریزی میں Gratitude کہا جاتا ہے۔ جبری حالات میں جب ایک انسان مثبت ردِّ عمل کا اظہار کرتا ہے تو اِسے صبر کہتے ہیں جبکہ موافق حالات میں جب ایک انسان نفسیاتی اطمینان کا اظہار کرتا ہے تو اِسے شکر کہتے ہیں۔ چنانچہ شکر بھی صبر کی طرح ایک مستقل نفسیاتی ہتھیار ہے جو ایک انسان کو اَنا پسندی (Egoism) اور تکبر (Arrogance) سے بچاتا ہے۔

جب کوئی انسان دیکھتا ہے کہ وہ قدرتی طور پر ایسے حالات سے ہمکنار ہو گیا ہے کہ اب اُسے وہ محنت و مشقّت نہیں کرنا پڑے گی جو عموماً ایک عام آدمی کو کرنا پڑتی ہے تو وہ گمان کرنے لگتا ہے کہ شاید یہ اُس کا پیدائشی حق تھا اور آئندہ بھی زندگی اُس کے ساتھ ایسے ہی ٹھنڈے میٹھے طریقے سے پیش آئے گی، پس یہ گمان ہی اُس کو خودسر اور متکبّر بنا دیتا ہے اور پھر آخر میں یہی اَنا پسندی اور خودسری اُسے لے ڈوبتی ہے۔ اِس لئے قرآن ایک مؤمن کو شکر کرنا سکھاتا ہے تاکہ انسان اپنے بہتر حالات اور مثبت نتائج کو اپنی عقل اور اِرادے کا کمال نہ سمجھ بیٹھے بلکہ اِسے خدا تعالیٰ کی عنایت سمجھے۔ قرآن میں شکر کا لفظ کُل 47 بار آیا ہے اور ہر مقام پر ایک مؤمن کو یہی تلقین کی گئی کہ شکر کرتے رہو۔

فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ۔

پس مجھے یاد رکھو، تم مجھے یاد ہو اور میرا شکر بجالاتے رہو اور منکر نہ بن جانا۔

(سورہ البقرہ۔152)

صرف پانچ الفاظ پر مشتمل یہ آیت ایک انسان کی پوری زندگی کا احاطہ کئے ہوئے ہے کہ دیکھو انسانو! مَیں تمہارا خالق ہوں، مَیں تمہارا مالک ہوں اِس لئے یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھنا اور اِس کی فکر چھوڑ دو کہ مجھ پر ایمان کے بعد تمہارا کیا بنے گا، پس تم مجھے اچھی طرح یاد ہو کہ تم کیا ہو، ہاں بس مناسب حالات میں منفی رویہ نہ اختیار کر لینا کہ جو کچھ آسائشیں اور مال و دولت ہمارے پاس ہے اِس پر ہمارا حق تھا یا یہ تو ہماری ہی اصلی ملکیت ہے اور ہم نہیں مانتے کسی خدا وُدا کو، چنانچہ طاقت اور وسائل مل جانے کے بعد ایسا منکرانہ رویہ اختیار نہ کر لینا۔

بات یہ ہے کہ اگر آج کا انسان صرف اِسی ایک نفسیاتی تکنیک کو اپنا لے کہ میرے پاس جو کچھ ہے یا جو کچھ مَیں نے اپنی عقل اور اِرادے کے بل بوتے پر حاصل کیا ہے میرا اپنا کمال نہیں بلکہ میرے ربّ خدا تعالیٰ کی خاص عنایت ہے تو انسانی معاشرہ جنت بن جائے لیکن چونکہ ہر انسان کے اندر فوقیت کا جذبہ موجود ہے اِس لئے اپنی کامیابی کو کوئی بھی انسان خدا تعالیٰ کی عنایت نہیں سمجھتا اور پھر اِسی ذہنیت

کے ساتھ وسائل پر قبضہ کرتا چلا جاتا ہے۔ جس طرح مصیبت اور تکلیف کے موقع پر قرآن ایک مؤمن کو نفسیاتی طور پر بکھرنے سے بچاتا ہے بالکل ایسے ہی کامیابی اور آسائش کے موقع پر بھی قرآن ایک مؤمن کو اِس تباہ کن گمان سے بچا لیتا ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس موجود ہے یا حاصل کر لیا ہے یہ اُس کا پیدائشی حق تھا یا اُس کی عقل اور اِرادے کا کمال ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ۔

اے مؤمنو! کھاؤ اُس رزق میں سے جو تمہیں خدا نے عطاء کر دیا اور اِس پر خدا کا شکر اَدا کرو اگر تم صرف اُسی کی بندگی کا دَم بھرتے ہو۔ (سورہ البقرہ۔ آیت 172)

یعنی اگر خدا نے تمہیں رزقِ وافر عطاء کر دیا ہے تو اب ایسے موقع پر اپنے ربّ کا شکر اَدا کرو، یعنی یہ نہ سمجھ بیٹھو کہ اِس پر تو ہمارا حق تھا یا یہ تو ہمیں ہر صورت ملنا چاہیئے تھا کیونکہ دنیا میں لاکھوں لوگ ایسے ہیں جنہیں دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تو جس طرح وہ صبر کا مظاہرہ کر رہے ہیں ٹھیک اُسی طرح تم شکر کا مظاہرہ کرو اگر تم سمجھتے ہو کہ تم خدا کے بندے ہو۔ پس اگر تم ایمان نہیں رکھتے تو پھر تم آزاد ہو کہ جس طرح کا رویہ اپناؤ لیکن پھر اپنے اِس رویے کے خدا کے ہاں جوابدہ تو ٹھہرو گے۔

آج انسانی معاشرہ کیوں غربت و افلاس اور بھکُ مَری کا شکار ہے کیونکہ آج ہر انسان اپنے وسائل کو اپنی عقل اور اِرادے کا کمال سمجھنے لگا ہے اور گمان کرتا ہے کہ جو کچھ اُس کے پاس ہے یا تو اِس پر اِس کا پیدائشی حق ہے یا پھر اِس نے سارا کچھ اپنی محنت و مشقّت سے حاصل کیا ہے اور اِسی سے پھر اصلی تکبر جنم لیتا ہے جس کی مخالفت قرآن کئی مقامات پر کرتا ہے۔

مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا۔

خدا کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ عذاب میں مبتلا کر دے اگر تم شکر اور ایمان کا راستہ اپنا لیتے ہو اور بات یہ ہے کہ اللہ ایسے بندوں کا بڑا قدر دان اور علم رکھنے والا ہے۔(سورہ النساء۔ آیت 147)

یعنی شکر بھی صبر ہی کی طرح ایمان کا جُز بن جاتا ہے جب ایک مؤمن خدا کے عطاء کردہ وسائل اور آسائشوں کو خدا کی عنایت سمجھ لیتا ہے اور اپنی عقل اور اِرادے کو خدا کے حضور پیش کر دیتا ہے۔

ایک شخص خدا پر ایمان رکھ کر جب اپنی عقل اور اِرادے کی وساطت سے کوئی کامیابی حاصل کرلیتا ہے تو وہ فوری طور پر اِس کامیابی کا کریڈٹ خدا تعالیٰ کی ذات کو دے دیتا ہے اور اِسی طرح وہ خدا کے ہاں سے مزید عنایات کا حقدار ٹھہر جاتا ہے

جبکہ اِس کے بر عکس اگر کوئی منکر اپنی عقل اور اِرادے سے کچھ پالیتا ہے تو وہ اِس زعم میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب تو اُسی اپنا کمال ہے اور یوں وہ تکبر و اَنا پرستی کی گہری کھائی میں گر کر ہر اپنے اِس منکرانہ رویے کے سبب ہر شے سے محروم ہو جاتا ہے بلکہ اُلٹا خدا کی نازل کردہ مصیبتوں میں گرفتار ہو جاتا ہے۔

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكُمْ لَئِن شَكَرْتُمْ لَأَزِيدَنَّكُمْ ۖ وَلَئِن كَفَرْتُمْ إِنَّ عَذَابِي لَشَدِيدٌ۔

اور یاد کرو جب تمہارے پروردگار نے تمہیں مطلع کر دیا تھا کہ اگر تم شکر اَدا کروگے تو میں تمہیں اور زیادہ دوں گا اور اگر کفرانِ نعمت یعنی ناشکری کروگے تو پھر میرا عذاب بھی بڑا سخت ہے۔(سورہ ابراہیم۔ آیت 7)

اب رستے دو ہی ہیں۔ ایک وہ رستہ جو ایک مؤمن اختیار کرتا ہے اور دوسرا وہ رستہ جو ایک منکر اختیار کرتا ہے اور دونوں رستوں کے نتائج پوری طرح واضح ہو چکے، پس اب یہ انسان کا اپنا اختیار ہے کہ وہ اپنے لئے کس رستے کا انتخاب کرتا ہے۔

☆☆☆☆☆

سید المجاذیب خواجہ نعمان نیئر کلاچوی صوبہ خیبر پختونخواہ کی ایک دور اُفتادہ تحصیل کلاچی کے باسی ہیں۔ آپ ایک جامع العلوم شخصیت ہیں ۔ آپ بیک وقت مذاہبِ عالم، علم الکلام و فلسفہ، شعر و اَدب، صحافت و بلاغت، معاشرت و سیاست، نفسیات و روحانیات اور رقص و موسیقی پر گہری گرفت رکھتے ہیں۔ آپ ایک طویل عرصے سے مسلسل گوشہ نشینی اختیار کئے ہوئے ہیں اور دریں اثناء علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ماڈرن فلاسفی اور علمِ نفسیات پر آپ کا علمی کام اُردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں انٹرنیٹ پر ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ آپ چھ کتابوں "عشق کی سائنس"، "تصوف کی ڈکشنری"، "صراطِ دانش"، "سوزِ نہاں"، "قبیلہ نوراحمد خیل" اور " Trek to Intellect " کے مصنف ہیں۔ علاوہ ازیں دیگر کئی مقالات و علمی شذرات کے بھی مؤلف و مصنف ہیں۔ زیرِ نظر مقالہ بھی آپ ہی کی علمی و تحقیقی جہد کا ماحصل ہے۔